ڈاکٹرعزیزابن الحسن

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی، منٹو اور محمد حسن عسکری

Dr Aziz Ibnul Hasan

Assitant Professor,Department of Urdu,Internationa Islamic University, Islamabad

Ahmad Nadeem Qasmi: Minto and Muhammed Hasan Askari

Saadat Hassan Manto, Muhammad Hasan Askari and Ahmad Nadeem Qasmi were the most respected names among the scholars, critics, creative writers and theorists of modern Urdu literature. Their contribution in shaping Urdu literature through their powerful ideas and works is unparallel. Manto was one of the few Urdu writers who both shaped and flouted the prevailing ideologies of his time and depicted his ideas in a fresh voice to contemporary readers.

Askari was an important voice within the modernist movement but after independence, he became increasingly engaged in the transition to and formulation of Pakistani national culture and literature and then, near the end of his life, went to some philosophical religious and metaphysical issues.

Qasmi was a major figure in contemporary Urdu literature His poetry stood out among his contemporaries' work for its unflinching humanism, and his Urdu afsana work is considered by some second only to Prem Chand in masterful depiction of rural culture.

The aim of this article is to trace out the underling reasons and causes of controversy that broke out between these three figures of Urdu literature after independence on account of the role of Progressive Writers' Association in Pakistan.

سعادت حسن منٹو(1912-1955)، محمد حسن عسکری(1919-1978) اور احمد ندیم قاسمی(1916-2006) بیسویں صدی کے اردو ادب کے تین اہم نام ہیں۔ تینوں نے اپنے اپنے شعبوں میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ان شعبوں میں ان کی ادبی و شخصی

انفرادیت گذشتہ ساٹھ ستر برس کی ادبی تاریخ میں انمٹ طور پر ثبت ہو چکی ہے۔ تینوں بلند پایہ ادیب کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان تینوں میں جہاں اختلاف کے بہت سے پہلو تھے وہاں یہ بات سب میں مشترک تھی کہ یہ سب افسانہ نگار بھی تھے۔ منٹو افسانے کی حقیقت نگارانہ روایت کے امام تو تھے ہی، وارث علوی جیسے فکشن کے جید نقاد کے مطابق وہ فکشن کے ایک زیرک نقاد بھی تھے۔ اس امر کے ثبوت میں منٹو کی دیگر بہت سی تحریروں کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے خطوط بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار اور ایک موقر رسالے *فنون* کے مدیر کی حیثیت سے بھی ناقابل فراموش ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی طویل اور سرگرم زندگی جدید اردو ادب کے اتار چڑھاؤ کے ایک ایک معتبر گواہ کی بھی ہے۔ محمد حسن عسکری کی عمومی شہرت ایک نقاد کی تھی مگر ابتداً وہ بھی ایک افسانہ نگار تھے اور افسانہ نگار بھی ایسے کہ افسانے کی بعض نئی تیکنیکوں کا انہیں پیش رو بھی کہا گیا ہے۔ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے تو عسکری کو افسانے میں غلام عباس سے بھی اونچا درجہ دیا ہے۔[۱]

جدید اردو ادب کے ان تینوں معتبر ادیبوں میں ایک امر یہ بھی مشترک تھا کہ اپنے دور میں ان کی وجہ سے ادبی تنازعات بھی خوب کھڑے ہوئے۔ کبھی مخالفین نے ان سے کچھ منسوب کر کے تنازع پیدا کیا، کبھی ان کے محبین و متوسلین نے ان کے بارے میں مبالغہ آمیزی کر کے دوسرے دھڑے والوں کو ردِعمل پر مائل کیا۔ اور سچی بات تو یہ کہ یہ تینوں خود بھی آ بیل مجھے مار کی روش پر چلنے سے باز نہیں آئے تھے۔ اسی لیے اپنی زندگی کے کسی بھی حصے میں یہ بزرگان ادب غیر اہم نہیں رہے۔ اپنے اپنے ادبی نظریات میں بھی ہمارے یہ تینوں محترم نام بڑے پختہ اور راسخ الفکر واقع ہوئے تھے۔ ایک ہی ادبی دنیا مگر مختلف ادبی فضا میں رہنے کی وجہ سے ان میں قرب اور یگانگت کے تعلقات بھی رہے تھے مگر معاصریت کی چشمک نے انہیں ایک دوسرے سے نالاں بھی رکھا۔

احمد ندیم قاسمی اور منٹو کے تعلقات کی ابتدا جنوری 1937 میں منٹو کی طرف سے ہوئی تھی۔[۲] مگر منٹو کو ابتدا ہی سے یہ کھٹکا لگا رہا کہ ان کے یہ تعلقات کہیں کسی الجھن کا شکار نہ ہو جائیں۔[۳] اور منٹو کے مزاج کی کسی لرزاں کیفیت کی وجہ سے دہلی میں منٹو سے اپنی پہلی ملاقات پر قاسمی صاحب بھی یہ جان گئے منٹو کو یہ خدشہ کیوں تھا۔ اپنے خطوط میں منٹو کا قاسمی سے بے حد احترام، محبت اور بے تکلفی کا رویہ نظر آتا ہے، مگر عمر اور تجربے کے فرق کی وجہ سے (عمر کا فرق تھوڑا مگر ادبی و دنیاداری کے تجربے کا فرق زیادہ) وہ قاسمی صاحب کو نصیحت، سرزنش بے تکلفانہ ڈانٹ ڈپٹ اور کبھی کبھی ان کے ادبی رویوں پر اظہار ناپسندیدگی بھی بلا جھجک کرتے نظر آتے ہیں۔ منٹو کو قاسمی کی تحریروں میں جو شے اول سے آخر تک کھلتی تھی وہ ان کی ''جذباتیت'' تھی۔ وہ قاسمی صاحب کو ''نہایت درجہ سادہ لوح اور ہڈیوں کے گودے تک جذباتی آدمی'' سمجھتے تھے۔

ہمارے ان دونوں افسانہ نگاروں کے مابین جنوری 1937 میں قائم ہونے والا مؤدت اور انس کا رشتہ یہ قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک کی ادبی و سیاسی ترجیحات کی وجہ سے یکا یک نظریاتی اختلاف کے بھنور میں آ گیا اور خاصی تلخی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ قاسمی صاحب چونکہ تا زندگی اس کا ذمہ دار محمد حسن عسکری کو سمجھتے رہے تھے، اس لیے ہم عسکری، منٹو اور ترقی پسند تحریک کے باہمی تعلق پر ذرا مفصل روشنی ڈالیں گے۔

محمد حسن عسکری اور منٹو کی دوستی کی ابتدا پر مختلف آرا ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ عسکری کا منٹو سے گہرا تعلق قیام پاکستان کے بعد اس کے افسانے 'بابو گوپی ناتھ' کی اشاعت کے زمانے میں ہوا تھا۔[۴] ان دونوں میں دوستی نظریاتی ہم آہنگی کے سبب ہوئی تھی۔ جدید اردو ادب کی تاریخ میں دو افراد کے باہمی نظریاتی اشتراک سے پیدا ہونے والی 'دوستی' کی یہ شاید واحد مثال ہے، جس کی مخالفت میں اس زمانے میں ایک پوری تحریک کھڑی ہو گئی تھی۔

تقسیم ہند سے پہلے منٹو بمبئی میں تھا۔ بعد میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔ تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور پھر کشمیر کے مسئلے پر پاکستانی موقف کی قبولیت کے حوالے سے ترقی پسند گومگو کی کیفیت میں تھے۔ شروع میں تو منٹو کے اندر بھی اس حوالے سے کچھ کشا کش تھی مگر اگست 1947 کے بعد منٹو جیسا ٹھوس حقائق کو وجودی تجربہ بنا کر لکھنے والا یہ فنکار خود کو قیام پاکستان اور نظریہ پاکستان کے حق میں یکسو کر چکا تھا۔ ۵ ایسے میں جب کہ نظریہ پاکستان، برصغیر پاک و ہند میں مسلمان قوم کے انفرادی خدوخال اور ان کے تہذیب و کلچر اور مسلمانوں کے حق خودارادیت کے حوالے سے محمد حسن عسکری اور منٹو کے اندر نظری اشتراک کا شعور گہرا ہو چلا تھا، انہوں نے مل کر ''اردو ادب'' کے نام 1948 میں سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے یوں تو دو ہی شمارے نکلے مگر ایک تاریخ رقم کر گئے۔

گو بعد میں عسکری کا منٹو سے ملنا کم ہو گیا تھا مگر ہجرت کے ان ابتدائی برسوں میں عسکری منٹو دوستی کی بڑی کہانیاں اڑیں، جسکی طرف انہوں نے جابجا اشارے کئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں انہوں نے لکھا کہ

> ''منٹو کی اور میری دوستی کا شمار بھی نئے ادب کی تاریخ کے لطیفوں میں ہونا چاہئے۔ ہم دو آدمی ایک دوسرے سے کیا ملنے جلنے لگے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ یہ سمجھا کے میرے خلاف محاذ قائم ہوا ہے۔ منٹو کی تعریف میں میرے دو جملے لکھنا تو اور بھی غضب ہو گیا۔'' ۶

حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ پاکستان میں آنے کے بعد عسکری نے لکھنے والوں سے یہ تقاضہ شروع کر رکھا تھا کہ پاکستان کے اہل دماغ اور اہل قلم طبقے کو اپنے تہذیب و کلچر کو ایک زندہ مسئلہ جان کر اسے اپنے شعور کا حصہ بنانا چاہئے اور پاکستانی قوم کی امنگوں کو سمجھتے ہوئے اپنے رجحانات اور ترجیحات میں تبدیلیاں لانی چاہیے۔ اس طرح عسکری دراصل ایک نئی بوباس والے ادب کے امکان اور ضرورت کا احساس دلا رہے تھے۔ جس میں کچھ پاکستانی رنگ اور مزاج کی جھلک ہو۔ ۷ پاکستان میں عسکری کو اپنی اس آرزو میں جس ادیب کی طرف سے شراکت کا زبردست احساس ہوا وہ منٹو تھے، کیونکہ منٹو کے اندر بھی یہ تبدیلی تقسیم ہند کے بعد ہی آئی تھی۔ ۸ اور وہ منٹو کی طرف لپکے تھے:

> '' 'بابو گوپی ناتھ' پڑھنے سے پہلے میں شاذ و نادر ہی منٹو سے ملنے جاتا تھا کیونکہ عام رائے کے بموجب میں بھی منٹو کو ایسا آدمی سمجھتا تھا جس کی ساری دلچسپیاں لوگوں کو چونکانے اور بھڑکانے پر مرکوز ہوں، لیکن اس افسانے سے میں ایسا متاثر ہوا تھا کہ اب میں یہ باور کرنے کو مطلق تیار نہ تھا کہ کوئی چھوٹی شخصیت کا آدمی ایسا افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں فوراً منٹو سے ملنے پہنچا اور جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا تو میں نے منٹو کو جیسا سنا تھا اس کے بالکل برخلاف پایا۔ اس وقت پاکستان بنے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے اور ادیبوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ پاکستان کا حقیقت بن جانا کیسا ہی حیرت انگیز واقعہ سہی مگر اب اسے اپنے شعور میں جگہ دی جائے۔ مگر اپنے شعور میں تبدیلیاں کرنا، کسی نئی چیز کو شعور میں جگہ دینا، ان سب باتوں میں تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے ہمارے بیشتر ادیبوں کے ذہن تیار نہیں تھے، اور نہ آج ہیں۔ البتہ ایک منٹو کا ذہن ہے جو ٹھوس تجربے سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ منٹو نے پاکستان کے وجود میں آتے ہی یہ بات مان لی تھی کہ چاہے ہم اس حقیقت کے ظہور کے لئے پہلے سے تیار نہ ہوں؛ مگر اب اسے اپنے شعور سے باہر نہیں رکھا جا سکتا، اور چونکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے، اس لئے اپنی قبولیت میں اثباتی رنگ کیوں نہ ہو، اور اس حقیقت کو زیادہ سے زیادہ اثباتی چیز بنانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ منٹو نے اگر پاکستان کو قبول کر لیا تھا تو نہ اس میں کوئی

رجعت پسندی تھی نہ کوئی سازش تھی...'' ۹

عسکری منٹو دوستی میں جو ''غرض و غایت اور باہمی دلچسپی'' تھی وہ ان قتباسات سے ظاہر ہے۔اسی زمانے میں منٹو کا معروف افسانہ ''کھول دو'' اور ''سیاہ حاشیے'' وغیرہ آئے۔جن میں عسکری نے منٹو کے اندر پاکستان کے بننے کے بعد آنے والی اس تبدیلی کے آثار دیکھے جن میں انہیں ''نئے حالات'' کا شعور نظر آیا؛ انہوں نے منٹو پر لکھنا شروع کیا اور ''سیاہ حاشیے'' کا دیباچہ بھی لکھا۔''کھول دو'' کی حد تک ترقی پسندوں کو منٹو سے کوئی شکایت نہیں تھی، مگر 'سیاہ حاشیے' تک آتے آتے ادبی سیاست بدل چکی تھی۔اب ترقی پسند منٹو صاحب سے فرنٹ تھے۔منٹو صاحب نے ایک ستم تو یہ کیا کہ 'سیاہ حاشیے' میں ترقی پسند تحریک کی منظور کردہ انسان دوستی سے تجاوز کر کے وہ انداز نظر اپنایا جسے ترقی پسند غیر انسانی اور سفاکی کا رویہ بتاتے تھے۔اوپر سے یہ قہر ڈھایا کہ اس مجموعے کا دیباچہ عسکری سے لکھوایا۔سو اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔۱۰

اصل بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ آئیڈیالوجی میں چولی دامن کا ساتھ تھا، یہ آئیڈیالوجی ابتداً غیر اشتراکی ترقی پسندوں کے سامنے کھل کر نہیں آئی۔مگر تقسیم کے بعد اُس کی متوازن پالیسی پر حاوی ہوتی گئی اور تحریک کا مرکز بھی بتدریج لکھنو سے بمبئی منتقل ہو گیا۔مئی ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے علاقے ''بھیمڑی'' میں انجمن کی جو پانچویں کل ہند کانفرنس ہوئی، اس میں ۱۹۳۶ء کے مینی فسٹو کو نا کافی جانتے ہوئے ایک نیا مینی فسٹو جاری کیا گیا تھا، جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔پاکستان بننے کے بعد یہاں کے ترقی پسندوں میں شدت کی جو ایک نئی لہر آئی اس میں نئے مینی فسٹو کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چند انفرادی مثالوں سے قطع نظر ترقی پسند تحریک عمومی طور پر پاکستانی سیاست اور رجحانات سے ہم آہنگ نہ تھی اور اس کا اولین مظاہرہ کشمیر کے مسئلے پر حکومت پاکستان کے موقف کے بجائے ہندوستانی موقف کی کھلے بندوں حمایت کے طرز عمل میں ہوا تھا۔پروفیسر پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کی جنگ کے سلسلے میں اگر سجاد ظہیر کھلم کھلا بھارت کا ساتھ دے رہے تھے تو دوسرے ترقی پسند ادیب اپنے اندر 'رائے عامہ کی مخالفت' کی ہمت نہ پا کر خاموش تھے۔یوں وہ اپنی خاموشی اور لاتعلقی سے بھارت کی در پردہ حمایت کے راستے پر گامزن تھے۔ان ترقی پسند ادیبوں کو بخوبی علم تھا کہ کشمیر اور پاکستان کے عوام کیا چاہتے ہیں۔اس کے باوجود یہ لوگ عوامی امنگوں کو خاک میں ملا کر کشمیر پر بھارت کے حملے کی بین السطور تائید میں مصروف تھے''۔ ۱۱

پاکستان بننے کے بعد ترقی پسند تحریک کی لاہور میں دو کانفرنسیں اس اعتبار سے بہت اہم ہوئیں کہ بعد کی ادبی فضا پر ان کے تادیر اثرات رہے۔ایک وہ جو پاکستانی ادیبوں کی کانفرنس کے نام سے دسمبر ۱۹۴۷ء میں، اور دوسری ترقی پسند تحریک کی پہلی کل پاکستان کانفرنس جو ۱۱، ۱۲، ۱۳، نومبر ۴۹ء کو لاہور میں ہوئی۔پہلی کانفرنس میں کشمیر کے مسئلے نے ایک تنازع کی صورت اختیار کر لی تھی؛ جبکہ دوسری کانفرنس میں بھیمڑی (بمبئی) کانفرنس کی سخت گیر پالیسی کے تتبع میں یہاں بھی نہ صرف ایک نیا منشور جاری کیا گیا بلکہ ترقی پسند تحریک کی تاریخ کی وہ بد ترین قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں غیر ترقی پسند اور نا متفق ادیبوں کا دہرا بائیکاٹ کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا اثر تو شروع ہی سے تھا مگر قیام پاکستان کے بعد یہ گرفت بڑھتی ہی گئی تھی۔اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی پالیسی میں شدت اور انتہا پرستی پیدا ہو رہی تھی۔تفصیل کا یہ موقعہ نہیں لیکن چشم کشائی کے لیے پاکستان میں ہونے والی اس کانفرنس کے منشور (مشمولہ سویرا، شمارہ ۷، ۸) اور کل ہند کانفرنس، منعقدہ مئی ۱۹۴۹ء، بھیمڑی، کے اس نئے منشور کا ایک تقابلی مطالعہ مفید ہوگا جس سے بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''تحریک کو فائدہ پہنچے کے بجائے بعض ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتائج ترقی

پسندوں کی اس تحریک اور ادبی تخلیقات کی پیداوار دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوئے''۔۱۲ ان منشوروں میں سرمایہ دار طبقے، فاشزم کے مظالم، عوام کی شہری آزادی، جمہوری قوتوں کے فروغ، مزدور، کسان اور متوسط طبقے کی جدوجہد کا ذکر تو ہونا ہی چاہیے تھا، مگر ہمارے اعتبار سے زیادہ اہم شے ان دونوں منشوروں کی وہ مشترک لفظیات و مفاہیم ہیں، جس کی زد میں ایسے ترقی پسند ادیب آئے تھے جو مخصوص اشتراکی نظریات کا چولا پہنے بغیر ترقی پسند رہنا چاہتے تھے۔

ان منشوروں کے نہ صرف مفاہیم اور مطالب بلکہ لفظیات تک کی حیرت انگیز مماثلت سے ایک تو عسکری کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ پاکستان کے ترقی پسندوں پر بمبئے گروپ کا قبضہ تھا اور احمد ندیم قاسمی کا یہ کہنا محض سادگی کہ ''انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان ایک قطعی الگ ادارہ ہے اور ہندوستان کی انجمن سے اس کا صرف اتنا تعلق ہے جتنا مشرق و مغرب کی تمام دوسری ترقی پسند انجمنوں سے''۔۱۳ دوسرے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ان امور کی زد میں جو لوگ آئے اور جن کے ادبی بائیکاٹ کی قرارداد بھی پیش کی گئی، ان میں سرفہرست محمد حسن عسکری تھے کہ ادب برائے ادب، پاکستانی ادب، اسلامی ادب، نفسیاتی موشگافیوں اور اسلوب کی فوقیت کے مسائل سب سے زیادہ انہیں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔۱۴ اور دوسرے نمبر پر سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، صمد شاہین، احمد علی اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ تھے۔

کسی جماعت یا گروہ کو اپنے نظریات متعین کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا پورا حق ہے مگر اپنے مخالفوں کے ساتھ یہ سلوک اس فسطائیت کی بدترین مثال تھی جس کا مرتکب ترقی پسند، سامراجی قوتوں، سرمایہ دار طبقوں اور ان کی نمائندہ حکومتوں بشمول اس وقت کی مسلم لیگی قیادت کو قرار دیتے رہے تھے۔ اختر حسین رائے پوری کے ایک مضمون ''سوویٹ روس کا ادب'' میں بالتفصیل یہ اشارہ موجود ہے کہ سویت روس میں اشتراکی صراط مستقیم سے ہٹنے والے ادباء کو کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ *ادب اور انقلاب* سے جستہ جستہ اقتباسات ملاحظہ ہوں: ''گمیلیف،...رجعت پرستانہ سازش کے الزام میں قتل کر دیا گیا''۔ (*ادب اور انقلاب*، ص۱۳۴) ''یزنین،...ماحول اور شخصیت کی کشمکش اس کے لئے جان لیوا ہوگئی اور اس نے تیس سال کی عمر میں پھانسی لگا کر خودکشی کر لی''۔ (ایضاً، ص۱۳۵) زمیاتن، جس کے ناول 'ہم' پر ارباب وقت کا عتاب نازل ہوا تھا، ''روس میں اشاعت کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے...انگریزی میں امریکہ میں شائع ہوا تھا...اور اسی وجہ سے زمیاتن کو روس چھوڑ کر پیرس سکونت اختیار کرنا پڑی''۔ (ایضاً، ص۱۴۸۔۱۴۶) میکوویسکی کہ انقلابی انجمن کے ''تشدد نے جس کی زندگی دوبھر کر دی اور ۳۲ء میں وہ خودکشی کر کے مر گیا''۔ (ایضاً، ص۱۶۴) ورنسکی ''روس سے نکال دیا گیا''، (ایضاً، ص۱۶۶) وغیرہ وغیرہ۔ ان مثالوں کے علاوہ روس کے بعض جلاوطن ادیبوں سے پیرس میں اپنی ملاقاتوں کا احوال انہوں نے *گرد راہ* میں بھی لکھا ہے۔ ۱۵

یہاں ترقی پسندوں کو اگر طاقت حاصل ہوگئی ہوتی تو وہ جو کچھ کرتے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے کسی الہامی بصیرت کی ضرورت نہیں۔ اس ادبی بائیکاٹ اور اپنے مخالفوں کو ادبی لٹیرے، رجعت پسند، عوام دشمن اور حکمرانوں کے نقارچی وغیرہ کے القابات نے ہوا کا رخ ضرور بتا دیا تھا۔ اس طرح عسکری کے ان بدترین اندیشوں کی تصدیق بھی ہوگئی تھی جن کے مطابق انہوں نے اجتماعیت پرستی کو، خواہ وہ مسلم لیگیوں کی ہو یا کمیونسٹوں کی، خطرناک قرار دیا تھا۔۱۶ اجمل کمال نے ایک دفعہ عسکری پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں سے کہیں بھی کمیونسٹ پارٹی کو اقتدار نہیں ملا اس لئے عسکری کے اس خیال کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکی۔۱۷ درج بالا حقائق کے بعد اجمل کمال کی اس بات کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

انتظار حسین اپنی پرانی یادوں میں بتاتے ہیں کہ اس قرارداد مقاطعہ کے بہت عرصہ بعد انہوں نے جب سبط حسن سے پارٹی کے اس اقدام کا پوچھا تو انہوں نے نہایت سے صاف گوئی سے اس قرارداد کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس انتہا پسندی کو غلطی قرار دیا اور وجہ اس کی یہ بتائی گئی کہ انقلاب چین کی وجہ سے ترقی پسندوں کا دماغ پھر گیا تھا اور ہم سمجھے تھے کہ بس پاکستان میں بھی سرخ انقلاب آیا کہ آیا۔ ۱۸ پچاس سال بعد معروف ترقی پسند صحافی اور شاعر خلیق ابراہیم خلیق نے بھیڑی کانفرنس کی قرارداد سے فروغ پانے والی انتہا پسندی کا سبب یہی بتایا کہ مشرقی یورپ اور چین میں انقلابیوں کی تابڑ توڑ کامیابیوں نے پاک و ہند کے ترقی پسندوں کو معروضی سماجی حقائق کے غلط اندازے لگانے پر مائل کر دیا تھا۔ ۱۹

اس جارحیت کے بعد ترقی پسندوں کو اپنی غلطی کا احساس تو جلد ہی ہو گیا تھا کیونکہ اپنے ادبی مخالفوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے اور انہیں گمنامی کی موت مارنے کا وہ منصوبہ کسی طرح کامیاب ہوتا نظر نہ آیا تھا جس کی طرف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے منٹو کے نام ایک خط میں اشارہ کیا تھا۔ ۲۰ بعد میں بائیکاٹ کے اس فعل کی طرح طرح سے تاویلیں اور سخن سازیاں کی گئیں۔ اس ضمن میں سب سے تعجب خیز رویہ بزرگ افسانہ نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی کا رہا جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد منٹو کے فکر و خیال اور افسانوی شعور میں آنے والی ادبی و تہذیبی تبدیلی کو ترقی پسندی کے مخصوص تصور کے مطابق نہ پا کر اُس سے اختلاف کے اظہار کا یہ انوکھا طریقہ نکالا کہ منٹو جیسے لبرل، سیکولر اور وسیع المشرب ''ترقی پسند'' کو ''خراب'' کرنے کی ساری ذمہ داری عسکری کے سر ڈال دی تھی۔

سیاہ حاشیے منٹو کی یادگار تحریروں میں سے ہے جس پر ایک اور حاشیہ عسکری کے دیباچے کی صورت لگا ہوا تھا۔ اجمل کمال بعد تک ترقی پسندوں کی پچاس سالہ پرانی باتوں کو دہراتے ہوئے لکھتے رہے ہیں کہ تقسیم کے بعد عسکری کی منٹو سے دوستی موقع پرستی کے تحت تھی اور انہیں منٹو پر قبضہ جمانے کا موقع اُس وقت ملا جب ترقی پسندوں نے ایک احمقانہ قرارداد کے ذریعے نامتفق ادیبوں کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ منٹو سے عسکری کی دوستی ۱۹۴۸ سے اور تعلق اس سے بھی پرانا تھا۔ جبکہ بہ اصطلاحِ عبدالسلام خورشید، ''ادبی پبلک سیفٹی ایکٹ'' ۲۱ کے تحت ترقی پسندوں کی قرارداد مقاطعہ کی منظوری نومبر ۱۹۴۹ء میں آئی تھی، لہٰذا اس قرارداد کے بعد منٹو پر قبضہ جمانے والی بات تو صریحاً غلط ہے۔ اور ترقی پسندوں کا اصل مقاطعہ تو عسکری سے تھا منٹو کو زیادہ قیمت عسکری کے نقطہ نظر سے ہم نوائی کی وجہ سے ادا کرنی پڑی تھی۔ اس حاشیے نے ترقی پسندوں کی لگائی اُس آگ پر تیل کا کام کیا جسے منٹو کو رجعت پرست قرار دلوانے کے نام پر ہوا دی جا رہی تھی۔ بعد میں عسکری اور منٹو نے مل کر جب دوماہی *اردو ادب* شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس آگ کی تپش اور بھی بڑھ گئی اور انہوں نے دشنام و ملامت کا ایک بازار گرم کر دیا۔

اردو ادب کے پہلے شمارے کے اداریے میں عسکری اور منٹو نے من جملہ اور باتوں کے لکھا تھا کہ

> '' 'اردو ادب' شائع ہونا تو دور رہا، ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا کہ دنیائے ادب میں ایک افسانہ بن گیا۔ کسی کو خطرہ پیدا ہوا کہ رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے۔ کسی کو دھڑکا ہوا کہ یہ کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے۔ کسی کو پتہ چلا کہ یہ رسالہ پاکستان کی حکومت کا ایجنٹ ہوگا۔ اسی رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنف ادب 'کھلے خط' کا اضافہ ہوا، غرض لوگ طرح طرح سے کھلے''۔ ۲۲

''کھلے خط کی نئی صنف'' سے اشارہ احمد ندیم قاسمی کے اس مشہور خط کی طرف ہے جس میں انہوں نے منٹو کی ''گمراہی'' کی ساری ذمہ داری عسکری کے سر ڈال دی تھی۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی اس پوری صورت حال کی تپش کو کم کرنے کی پوری کوشش کرتے رہے ہیں ۲۳ کہ میرا خط

پڑھنے کے بعد منٹو نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہ کیا اور ہماری دوستی یوں ہی چلتی رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔ مگر منٹو کے مجموعے یزید کا اختتامیہ ان باتوں کی تصدیق نہیں کرتا، جس میں منٹو نے تمام قرض چکا دیا ہے:

''مجھے اس وقت دکھ ہوا، بہت بڑا دکھ، جب میرے چند ہم عصروں نے میری اس کوشش کا مضحکہ اڑایا۔ مجھے لطیفہ باز، یاوہ گو، سنکی، نامعقول اور رجعت پسند کہا گیا۔ میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگرٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں۔ اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چٹھی بھی شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے۔ اس میں بھی انہوں نے سیاہ حاشیے کی تضحیک میں کھلے طور پر قلمکاری کی۔... مجھے غصہ تھا، اس کا نہیں کہ الف نے مجھے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا، اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی''۔۲۴

قاسمی کا مؤقف ہے کہ ''یہ عسکری صاحب ہی کی سازش تھی کہ منٹو کے ہاں ترقی پسندی کی روجاری نہ رہ سکی''۔۲۵ جب کہ اس کے برعکس ممتاز حسن کا کہنا تھا کہ ''جب منٹو نے انسانیت کی موت کے غم میں اپنے صفحات کے حاشیے کو سیاہ کیا تو اس وقت بھی ترقی پسندی کی ایک لکیر اس کے سیاہ حاشیے میں موجود تھی'' اور پھر بغیر کسی شہادت کے یہ لکھا کہ ''منٹو کو... اس بات کا بھی پچھتاوا رہا کہ کاش وہ ان حضرت (عسکری) سے دیباچہ نہ لکھواتا''۔۲۶ اس امر سے قطع نظر کہ عسکری سے ملنے کے بعد منٹو کے ہاں ترقی پسندی کی روجاری نہ رہی یا ترقی پسندی کی کوئی لکیر اس کے سیاہ حاشیے میں موجود رہی، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب درست ہے تو پھر منٹو کے مجموعے چغد کے دیباچے کا کیا جواز ہے جس میں اس نے بتفصیل بتایا ہے کہ اس کے وہ افسانے جن کی ترقی پسند پہلے بہت تعریف کرتے تھے، اس کے پاکستان ہجرت کر آنے کے بعد یکا یک معتوب قرار پا گئے تھے۔ نام نہاد ترقی پسندوں کی یہی ''الٹی سیدھی زقندیں'' تھیں جو منٹو کو بہت کھلتی تھیں۔ اصل میں ترقی پسندوں کو اختلاف منٹو کے افسانوں سے نہیں بلکہ اس کے فنی شعور میں آنے والی اس تبدیلی کا رنج تھا جو ''پاکستانیت سے آلودہ'' ہو گئی تھی۔ ورنہ بمبئی میں بیٹھے علی سردار جعفری اور لاہور میں مقیم احمد ندیم قاسمی کے خط بنام منٹو میں عسکری کے حوالے سے وہ حیرت انگیز مماثلتیں نہ ہوتیں، جن کی طرف یزید کے اختتامیے اور چغد کے دیباچے میں اشارے ہیں۔ بقول منٹو کے عسکری کے دیباچے کی وجہ سے ''سیاہ حاشیے پریس کی سیاہی لگنے سے پہلے ہی 'روسیاہ' کر کے رجعت پسندی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی'' تھی۔۲۷ بمبئی میں عسکری اور منٹو کے تعلق پر جو پیچ و تاب تھے اس کا اندازہ *اردو ادب*، شمارہ ۲ میں شامل محمد علوی کے خط سے ہوتا ہے۔ بطور نمونہ یہ جملے دیکھئے: ''انجمن ترقی پسند مصنفین، بمبئی کے مسلسل کئی جلسوں میں بحث کا موضوع منٹو، عسکری، سیاہ حاشیے اور 'اردو ادب' رہا ہے۔ وہ لوگ جو اب تک منٹو کو ترقی پسند کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے، یک لخت اسے رجعت پسند کہنے لگ گئے... یعنی اب تک جو ان کیلئے ترقی پسند تھا، منٹو اور عسکری کے تعاون کی وجہ سے سب کا سب رجعت پسند بن گیا''۔۲۸ اور احمد ندیم قاسمی نے جب ایک کھلے خط میں منٹو کو مخاطب کر کے عسکری کے خیالات سے پناہ مانگنے کی تلقین کی تو کچھ اس طرح کے جملے وجود میں آئے:

''عسکری۔۔۔ جس کی ذہانت اندھا دھند مطالعے کے صحراؤں میں بھٹک چکی ہے، اس شان سے ابھرا ہے کہ منٹو کے خط و خال صرف غیر نمایاں ہی نہیں، بگڑے بگڑے سے بھی ہیں۔... عسکری کو آپ سے ایک ضروری کام ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی

صفوں میں انتشار۔۔۔آپ نے جانے یکا یک کیسے مان لیا کہ حسن عسکری تو پاکستان کا بہت ہی بڑا نقاد ہے؟ لطف یہ ہے کہ اس تعریف وتوصیف کے عین وسط میں رسالہ ''اردو ادب'' خیمہ زن ہے جس کو آپ دونوں مرتب کر رہے ہیں۔منٹو اور عسکری۔۔ زندگی اور خوابیدگی۔۔آگ اور پانی! برا نہ مانیے گا بھائی، آپ حسن عسکری کو راہ راست پر لانے نکلے تھے مگر ان کے فنی باغیچے میں مصنوعی پھولوں کی تڑک پھڑک دیکھ کر اپنی راہ ہی سے دور ہٹے جا رہے ہیں۔۔۔عسکری کو پھر سے اپنے افسانوں کے بجائے اپنے نظریات سے متاثر کر کے اپنی صفوں میں لائیے اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اس تحریک سے آپ تو دامن نہ چھڑائیے جسے آپ کے فن اور آپ کے اثرات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔۔۔آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی افیون سے بچیئے۔'اردو ادب' ضرور نکالیے مگر ایک معین نظریے کے ساتھ۔حسن عسکری سے ضرور تعاون کیجئے مگر ان کے نظریات کو مشرف بہ زندگی کرنے کے بعد''۔۲۹

اس سے قبل بمبئی سے علی سردار جعفری بھی اپنے ایک خط میں منٹو کو عسکری سے بچنے کے مشورے دے رہے تھے۔۳۰ یہ تو ۵۰۔۱۹۴۹ کی باتیں تھیں، بعد میں اجمل کمال نے بھی منٹو کے سیاہ حاشیے اور عسکری کے دیباچے میں ''کوئی شے مشترک نہ پا کر اسے منٹو کی غلط تعبیر قرار دیا ہے''۔سوال یہ ہے کہ سابقہ ترقی پسند ہوں یا حالیہ جدیدیت پرست، اتنا کچھ کہنے کی بجائے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اگر منٹو وہ نہیں تھا جو عسکری کہتے ہیں بلکہ وہ کچھ تھا جو یہ لوگ کہتے ہیں تو آخر منٹو نے یہ دیباچہ اپنی کتاب میں شامل کیوں کیا؟ اور یزید کا اختتامیہ و چغد کا زہریلا دیباچہ کیوں لکھا تھا؟ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عسکری نے یہ تحریر اصلاً سیاہ حاشیے کیلئے نہیں بلکہ ممتاز شیریں کے نیا دور کیلئے لکھی تھی، منٹو نے اسے دیکھا تو سیاہ حاشیے کیلئے پسند کر لیا۔۳۱

کچھ ایسے ہی امور کے پیش نظر پروفیسر فتح محمد ملک نے یہ کہا تھا:

''جو بات علی سردار جعفری نے بمبئی سے منٹو کے نام اپنے متذکرہ بالا خط میں کہی ہے، وہی بات لاہور سے احمد ندیم قاسمی نے منٹو کے نام اپنے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کے طویل کھلے خط میں کہی ہے۔ندیم صاحب کے خیال میں منٹو کو عسکری نے گمراہ کیا ہے اور عسکری کو وسعتِ مطالعہ نے۔تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا یہ خط دراصل محمد حسن عسکری کی نثری ہجو ہے۔یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کی ادبی رفاقت پر برصغیر کے ترقی پسندوں میں گہرے غم وغصہ کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔جب منٹو اور عسکری کی مشترکہ ادارت میں رسالہ 'اردو ادب' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو اس غم وغصہ نے ایک باقاعدہ عملی پروگرام کی شکل اختیار کر لی۔انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں سعادت حسن منٹو سمیت چند ناموار ادیبوں کے بائیکاٹ کی ایک با قاعدہ قرارداد منظور کر لی گئی۔چنانچہ 'اردو ادب' کے دوسرے اور آخری شمارے میں منٹو نے 'اردو ادب' سے ترقی پسندوں کے بائیکاٹ کی اطلاعات پر مشتمل خطوط پر 'حقہ پانی بند' کی سُرخی جمادی۔اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کے خط کا پورا متن پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں''۔۳۲

'حقہ پانی بند' کرنے والی اس قرارداد کا لطیفہ یہ ہوا کہ یہ سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن گئی۔بعد میں قاسمی صاحب طرح طرح کی تاویلوں کے ذریعے خود کو اس سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاسمی شروع میں اس سے پوری طرح متفق تھے؛ بلکہ جب رسالہ ادبِ لطیف نے اپنے ایک اداریے میں اس انتہا پسند قدم سے اختلاف کا اظہار کیا تو احمد ندیم قاسمی نے ادارہ ادب

لطیف سے نہ صرف پارٹی لائن سے انحراف کرنے پر کوتوالی انداز سے جواب طلبی کی بلکہ اس مقاطعے کا اخلاقی، سماجی اور ادبی جواز مہیا کر کے مزید دلائل سے اس اقدام کو ضروری قرار دیا تھا۔ ذیل میں پہلے *سویرا*، شمارہ ۷، ۸ سے اس کانفرنس کی کارروائی کے کچھ اقتباسات دیے جا رہے ہیں اور پھر ان کے حق میں قاسمی صاحب کے دلائل:

''رجعت پسند ادیبوں اور رسالوں سے انقطاع:...اب تک رجعت پسند، احیا پرست اور ہیئت زدہ اور فحش نویس ادیب، ترقی پسند رسالوں اور خود انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ادھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند اور نام نہاد غیر جانب دار رسالوں میں لکھ کر اپنے پڑھنے والوں کو مسلسل غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ملک کے سیاسی و سماجی حالات اور انجمن کے نئے انقلابی منشور نے اب اصلاح پسندی اور سمجھوتے بازی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس لئے کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے ان ادیبوں اور رسالوں سے مکمل انقطاع کا اعلان کیا گیا۔ اس تجویز پر ملک بھر کے ادبی حلقے چونک اٹھے ہیں۔ لیکن یہ قرارداد ترقی پسند ادیبوں اور ترقی پسند ادب پڑھنے والوں کی نظریاتی صفائی کے سلسلے میں بہت مفید رہی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی یہ علانیہ جانبداری ایک بہت بڑی مہم کی ابتدا ہے۔...(کیونکہ) ادیب یا تو ترقی پسند ہے یا ترقی پسند نہیں ہے''۔۳۳

احمد ندیم قاسمی کی ادارۂ *ادبِ لطیف* سے جواب طلبی اور انقطاع کے حق میں دلائل:

''ادارۂ *ادبِ لطیف* نے رجعتی ادیبوں اور رسالوں کے انقطاع کے سلسلے میں جان بوجھ کر ایک غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اسے یہ لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انقطاع کی یہ قرارداد کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور جب اسے کھلے اجلاس میں پڑھا گیا تو کانفرنس کا پنڈال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ ادارے نے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ 'ترقی پسندوں کے ایک حلقے میں اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے'۔ یہ ایک حلقہ کونسا ہے؟ اور کیا پاکستان بھر کے ترقی پسند ادیب مندوبین کی حیثیت سے اس اجلاس میں جمع نہیں ہوئے تھے، اور کیا *ادبِ لطیف* کے ادارے کے دو معزز رکن بھی مندوبین میں شریک نہیں تھے، اور کیا انہوں نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیا؟... پھر ادارے نے جو یہ غلط فہمی پھیلائی ہے اس کے پس پردہ نیت کا کوئی پہلو ہے یا کیا ہے؟ اگر قرارداد سے اختلاف ہی کرنا تھا تو صاف الفاظ میں لکھ دیا جاتا کہ 'یہ قرارداد متفقہ طور پر کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں منظور ہو چکی ہے لیکن ہم اس سے متفق نہیں ہیں، اگرچہ اتفاق کرنے والوں میں ہم بھی شامل تھے''۔

(یہی سوال خود قاسمی صاحب سے بھی کیا جانا چاہیے کہ کیا انہوں نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیا تھا؟ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ)

''ہو سکتا ہے ادارۂ *ادبِ لطیف* کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ انقطاع کی پالیسی کیوں وضع کی گئی، اس کی سماجی ضرورت کیا تھی، یہ قدم کیوں اٹھایا گیا، اور آج کیوں اٹھایا گیا؟ اس سے پہلے اس قسم کے انقطاع کو کیوں ضروری نہیں سمجھا گیا؟ اس سوال کا جواب بھی سماجی اور سیاسی حالات کے مطالعہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ماضی میں ہم سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں...(ان غلطیوں کی نوعیت یہ بتائی گئی کہ تقسیم سے پہلے ترقی پسندوں کا محاذ بہت پھیلا ہوا تھا اور وہ برطانوی سامراج کو دیس نکالا دینے کے کام میں مصروف تھے اس لئے اس وقت ان ادیبوں کو قبول کئے رکھنا ان کی مجبوری تھی مگر اب

ان سے نبٹنا ضروری ہو گیا ہے، کیونکہ) حکمرانوں کی طرح یہ مفاد پرست ادیب بھی ترقی پسندی ہی کا لبادہ اوڑھ کر آئے اور پردے ہی پردے میں احیا پرستی، قومی اور نسلی تفوق، انفرادیت پرستی، غیر جانبداری، روحانیت، کلیت، عینیت، لذت پرستی، اسلوب پرستی، اور بے شمار فراری اور ہوائی رجحانات کا وہ زہر پھیلانا شروع کیا کہ اگر ان کی خدمت میں ترقی پسند رسالوں کے صفحات اسی فراخ دلی سے پیش کئے جاتے رہتے تو اس سے بڑھ کر ترقی دشمنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا''۔۳۴

آگے قاسمی صاحب نے اس مقاطعے کی زد میں آنے والے ادیبوں اور رسائل کے نام دیے ہیں جو یہ ہیں: عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، ممتاز شیریں، ن م راشد، ممتاز مفتی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، محمد دین تاثیر، شفیق الرحمٰن اور محمد حسن عسکری؛ اور رسائل میں ماہ نو، ساقی، اردو ادب، اور نقوش بھی شامل تھے۔ یہ فہرست اور بھی طویل ہونے والی تھی اگر ترقی پسندوں کو طاقت حاصل ہو جاتی، جیسا کہ خود اس کارروائی میں درج ہے کہ یہ تو ایک بڑی مہم کی ابتداء ہے۔ بعد میں قاسمی صاحب نے اس قرارداد کو غلطی کہنا شروع کر دیا، بلکہ خود کو اس سے بری الذمہ بھی قرار دیا (میرے ہمسفر، ص ۶۴)، مگر قاسمی را حافظہ نہ باشد، وہ بھول گئے کہ اس سے قبل وہ ان ادیبوں کو قبول کئے رکھنے کے عمل کو غلطی لکھ چکے تھے اور قرارداد کے ذریعے اس غلطی کی تلافی بھی کی اور اس کی ضرورت کے حق میں دلائل بھی دیے تھے۔

بہر حال یہ سب کچھ اب تاریخ کا حصہ ہے، مگر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش اتنی آسانی سے تاریخ کا حصہ نہیں بن سکتی۔ تنقید کے جملہ فرائض میں سے ایک یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو جھوٹ بولنے سے تو نہیں روک سکتی مگر یہ کوشش ضرور کر سکتی ہے کہ جھوٹ بطور سچ کے مستحکم نہ ہونے پائے۔۳۵ محمد حسن عسکری اور منٹو کی اس زمانے کی تحریروں کو دیکھیں تو وہ آج بھی ہمارے لئے یہ فریضہ سرانجام دیتی نظر آتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی تحریروں کی روشنی میں پروفیسر فتح محمد ملک نے جب پاکستان کی سابقہ ادبی، ثقافتی و سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ

''یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر پاکستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے سعادت حسن منٹو کو رجعت پسند قرار دے دیا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ منٹو کا بائیکاٹ کرنے والی اس تنظیم کے سربراہ منٹو کے عزیز ترین دوست احمد ندیم قاسمی تھے۔ جنہوں نے منٹو کی اس 'گمراہی' کی ساری ذمہ داری محمد عسکری پر ڈال دی تھی۔ وقت نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ غلطی پر منٹو اور عسکری نہ تھے بلکہ انڈین کمیونسٹ پارٹی کی تراشیدہ پارٹی لائن کی غلامانہ پیروی کے مرتکب پاکستانی ترقی پسند تھے۔ منٹو اور عسکری ہر دو کی غلطی اگر کوئی تھی تو وہ اُن کی سچی اور کھری پاکستانیت تھی''۔۳۶

احمد ندیم قاسمی نے اپنے دوست پروفیسر فتح محمد ملک پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انہوں نے مجھے کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کا تابعدار لکھ دیا حالانکہ وہ کھلا خط تو میرے اپنے ذہن کی 'معصومانہ حرکت' تھی۔ (''رواں دواں''، کالم از احمد ندیم قاسمی مشمولہ جنگ ۹ فروری ۲۰۰۵) بڑی عمر میں جوانی کے مشاغل کو معصوم قرار دینے کی خواہش ایک فطری عمل ہے مگر اس سادگی پر مرنے کی خواہش کو سر دست مؤخر کرتے ہوئے ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ ان معصوم حرکتوں کے مسالے کو منٹو نے خود براہ راست روس کے کرملن سے بمبئی کھیت واڑی اور وہاں سے میکلوڈ روڈ پہنچے والا لکھا تھا۔۳۷ آج ہمیں پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب سعادت حسن منٹو۔ ایک نئی تعبیر پڑھ کر مسرت ہوتی ہے کہ منٹو کی وہ تعبیر جو محمد حسن عسکری ۵۰۔۱۹۴۹ میں کر رہے تھے اور جس پر انہیں آج تک معاف نہیں کیا جا رہا، اسے مصنف مذکور نے بہت برسوں بعد بدلائل مبرہن کر دیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی، منٹو اور محمد حسن عسکری کے ادبی تعلقات کا یہ معاملہ چونکہ ہماری ادبی تاریخ کے سیاہ ترین حاشیوں میں سے ایک تھا،

اس لئے ہم نے نسبتاً تفصیل سے اس کا ذکر کرنا مناسب جانا؛ ورنہ جہاں تک منٹو کے بارے میں اس رائے کا تعلق ہے کہ اسے محمد حسن عسکری نے ''خراب'' کیا تھا، اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ منٹو کے اپنے ذہن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی اور عسکری محض اسے اپنی ''میاؤں'' سے اتنی دور تک بھٹکا لے گئے تھے کہ اس سابقہ ترقی پسند شیر کی دھاڑ بھی اس زوال پرست ورجعت آمیز ''میاؤں'' کی تاب نہ لاسکی تھی، حال آنکہ منٹو خود عسکری یا کسی کے بھی زیر اثر آنے کی تردید کر چکے تھے۔۳۸ اصل بات یہ ہے کہ تقسیم کے بعد منٹو کے اپنے شعور میں بھی کچھ تبدیلیاں ضرور آچکی تھیں، عسکری کے دوستی اور طرز استدلال نے کایا کلپ کے اس عمل کو صرف کچھ تیز کر دیا تھا۔ البتہ *اردو ادب* شمارہ ۲ میں جاوید اقبال کا منٹو کے نام وہ خط جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''مجھے یہ تسلی ضرور ہے کہ سعادت حسن منٹو عسکری کی معیت میں ہے اور عسکری اسے غلط رستے پر چلنے سے ٹوکے گا، عسکری اسے بچالے گا''؛۳۹ اگر درست قیاسات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اردو تنقید و تہذیب کی تاریخ میں عسکری کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے اپنی موجودگی سے منٹو جیسے صاحب شعور اور آج تک کے سب سے بڑے افسانہ نگار کے ذہن کو نئی وسعتوں سے آشنا کر کے سیکولر انداز نظر ہی کو انسان دوستی اور آفاقیت سمجھنے کی بجائے اسے مسلم کلچر کے ٹھوس تجربے کی زمینی حقیقت کی طرف مائل کر دیا، یا ترقی پسندوں کے نقطہ نظر سے، بھٹکا دیا تھا۔

عسکری نے قائداعظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ ان کی قوت ارادی اتنی زبردست تھی کہ وہ حقیقتوں کو توڑ پھوڑ کر خوابوں کو حقیقت بنا دیتی تھی۔ (*جھلکیاں*، ص ۳۴۷) منٹو اور عسکری دونوں بے رحم حقیقت نگاری کے نمائندہ تھے۔ عسکری فن میں معروضیت اور لاتعلقی کو اہم جانتے تھے، مگر عسکری اور منٹو میں فرق یہ تھا کہ عسکری ادیب کی فن کارانہ شخصیت اور عام شخصیت میں فرق کرتے تھے اور عام شخصیت میں مثالیت پسندی کے قائل تھے، لیکن اس مثالیت کو فن میں ڈھالتے ہوئے شخصیت کی ترغیب سے بچنا ضروری خیال کرتے تھے۔ جبکہ منٹو اس ترغیب سے بھی بچ نکلا اور اس کی ذاتی زندگی کا ہر لمحہ بھی فنی جدوجہد میں تبدیل ہوگیا تھا۔۴۰ قیام پاکستان کے بعد عسکری اور منٹو دونوں نے اسی مثالیت پسندی سے کام لے کر ایسے ادب کی تخلیق کی ضرورت محسوس کی جو حقیقتوں کو توڑ پھوڑ کر خوابوں کو حقیقت بنا دے۔ یہی عسکری کا اسلامی و پاکستانی ادب تھا۔ منٹو عسکری اتحاد انہیں خوابوں میں شرکت کے احساس سے پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسندوں نے ''حکمرانوں کا نقارچی'' قرار دیا تھا۔ جہاں تک ان دونوں پر حکمرانوں کی نظر کرم کا تعلق ہے، اس کا حال منٹو نے *اردو ادب* کے شمارہ ا کے اداریے میں بیان کر ہی دیا تھا کہ حکومت وقت نے اس رسالے کی اشاعت کی راہ میں کس کسطرح کی رکاوٹیں ڈالی تھیں۔

ایک وقت وہ تھا جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے پاکستانی طرز احساس کو اپنانے کی وجہ سے منٹو کو رجعت پسند، لذت و جنس پرست، بیمار ذہنیت کا حامل اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا تھا۔ مگر اب ایک یہ بھی وقت ہے کہ منٹو کی پاکستانیت ہی کو معرض سوال بنا دیا گیا ہے۔۴۱ اور اسے پھر سے پکا ٹھکا اور سچا ترقی پسند قرار دیا جارہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اور منٹو کے تعلق کا یہ پہلو ہماری ادبی تاریخ میں عموماً زیر بحث آتا رہا ہے۔ درج بالا سطور سے یہ واضح ہے کہ قاسمی صاحب منٹو سے عسکری کی وجہ سے ناراض تھے ان کے نزدیک عسکری منٹو کو خراب کر رہے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے ابتداً قاسمی کی منٹو سے خاصی گاڑھی چھنتی تھی بعد میں قرارداد مقاطعہ کے سبب سے دونوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ازاں بعد بقول قاسمی صاحب منٹو سے ان کے تعلقات بحال ہوگئے تھے۔ کیا منٹو کا دل بھی قاسمی کی طرف سے صاف ہوگیا تھا؟ اس بارے میں راقم کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ البتہ محمد حسن عسکری اور قاسمی کے تعلق کی ڈور ایک دفعہ الجھی تو پھر کبھی نہیں سلجھ سکی۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع میں عسکری اور قاسمی صاحب

کے مابین بھی خط و کتابت کا ایک اہم دور گزرا ہے. اس بات کی طرف اشارہ مختلف موقعوں پر دونوں حضرات کی طرف سے کیا گیا۔ عسکری کے ایک خط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد نوشتہ ۱۲ جون ۱۹۴۵ از دہلی میں یہ اشارہ موجود ہے: ''کبھی آپ (ڈاکٹر آفتاب احمد) احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملتے ہیں؟ ایک زمانے میں میری اور ان کی بڑی باقاعدہ خط و کتابت تھی لیکن اب تو مدت سے انہوں نے رسید ہی نہیں دی۔ اگر آپ ان سے کبھی ملیں تو میرا سلام کہہ دیجیے گا''۔ اور عسکری کی وفات پر پی ٹی وی کے ایک تعزیتی پروگرام، جنوری ۱۹۷۸ میں احمد ندیم قاسمی نے بھی ان سے اپنے ادبی اختلافات اور شخصی تعلقات کے ذکر کے بعد واضحطور پر کہا تھا کہ :

> ''قیام پاکستان سے پہلے محمد حسن عسکری کے ساتھ بعض ادبی و شعری اور فنی مسائل پر میری بہت ہی بلیغ قسم کی خط و کتابت رہ چکی تھی۔۔ ہمارے تعلقات بہت پرانے تھے۔ ان کے خطوط کہیں نہ کہیں میرے پاس محفوظ ہوں گے۔ وہ فارغ التحصیل عسکری کے ادبی اور فنی جذبات اور ان مقاصد کے آئینہ دار ہیں جن کے لیے بعد میں نہوں نے اپنی عمر وقف کر دی''۔

قاسمی صاحب نے اپنے نام منٹو کے خطوط تو 1962 میں چھپوا دیئے تھے مگر نہ جانے کیوں عسکری کے خطوط کو انہوں نے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

مظفر علی سید نے عسکری کے خاکے ''محمد حسن عسکری: خانماں خراب''، مشمولہ *یادوں کی سرگمر*، میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق، لاہور میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ کو اپنا یہ خاکہ پڑھنے کے بعد ایک نجی محفل میں مظفر علی سید نے راقم کو بتایا کہ وہ قاسمی صاحب سے مسلسل اصرار کرتے رہے ہیں کہ آپ منٹو کے خطوط کی طرح عسکری کے یہ خطوط بھی شائع کر دیں۔ قاسمی صاحب پہلے تو پس و پیش کرتے رہے۔ پھر چپ سادھ لی۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے پھر کہا کہ وہ خطوط آپ ظاہر ہے کہ مجھے تو نہیں دیں گے، تو یوں کیجئے کہ اپنے کسی بااعتبار دوست مثلاً پروفیسر فتح محمد ملک ہی کو دے دیجئے۔ وہ ایک غیر جانبدار آدمی ہیں۔ وہ آپ کے مشورے سے انہیں ترتیب دیکر آپ کے حوالے کر دیں، آپ ان پر حواشی لکھ دیں اور کتاب کو چھپوا دیں۔ جواباً انھوں نے کہا کہ 'لوگ ویسے ہی میرے بارے میں باتیں بناتے رہتے ہیں کہ میں عسکری کے خلاف مہم جوئی میں لگا رہتا ہوں، وہ خطوط شائع کر دیے تو لوگ اور چراغ پا ہوں گے' ۔ مظفر علی سید نے کہا کہ ان خطوط میں اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے تو پھر تو ان کی اشاعت اور بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ جان جائیں کہ آپ کے مؤقف کی حمایت کی گنجائش خود عسکری کے خطوط میں موجود ہے۔ مگر قاسمی صاحب اس پر بھی نہیں مانے۔ مظفر صاحب کا کہنا تھا کہ آخر میں قاسمی صاحب نے انہیں یہ کہہ کر بالکل مایوس کر دیا کہ ان خطوط کو بعض مقامات سے دیمک کھا گئی ہے۔ افسوس کہ خطوط عسکری بنام احمد ندیم قاسمی کی اشاعت کا امکان قاسمی صاحب کے انتقال کے بعد شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ ورنہ عسکری کے دیگر خطوط کی اشاعت کی طرح یہ بھی کسی نئی بحث کے آغاز کا سبب بنتے!

منٹو، عسکری اور قاسمی آج ہم میں نہیں، ان کی رفاقت کے اتار چڑھاؤ کی یہ سرگزشت محض ان تین افراد کے نجی تعلقات کی کہانی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سب آج ہمارے لئے اہم نہ ہوتا۔ اس سرگزشت کے دامن میں ہماری ادبی تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جو ایک دفعہ ہو کر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ بعد میں بھی اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، دائرہ در دائرہ پھیلتے دوسرے افراد، نظریات اور رجحانات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ایسے واقعات اپنی جگہ خواہ کتنے ہی ناخوشگوار ہوں مگر افکار و تصورات کے فروغ اور ان کی صحت و غلطی کو پرکھنے میں یہ جدلیات نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس آئینۂ افکار میں ہم آج بھی اپنی اداد دیکھ سکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''محمد حسن عسکری کل اور آج''، مشمولہ شب خون، اکتوبر 2008 ,ص 28

۲۔ دیکھئے منٹو کے خطوط، مرتبہ احمد ندیم قاسمی، کتاب نما، راولپنڈی، 1966، مرتب کا دیباچہ اور مجموعے کے ابتدائی خطوط

۳۔ منٹو کے خطوط، ص153-152

۴۔ عسکری، محمد حسن، ''سعادت حسن منٹو''، مقالات محمد حسن عسکری، ج ۱، ص۴۱۴۔ مزید تفصیل کے لیے عسکری کی 49-1948 کی جھلکیاں مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۵۔ تفصیل اور زمانی حوالوں اور شہادتوں کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر فتح محمد ملک، ''منٹو کی پاکستانیت''، مشمولہ سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر۔

۶۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں، ص۳۵۷

۷۔ محمد حسن عسکری، ''پاکستانی ادب''؛ ''پاکستانی قوم ادب اور ادیب''، مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب، ص۵۱، ۵۷

۸۔ محمد حسن عسکری کی ''جھلکیاں'' جنوری ۱۹۴۹؛ مئی، جون ۱۹۴۹؛ جنوری ۵۰؛ جنوری، فروری ۵۱؛ فروری ۵۵، مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب؛ ''فسادات اور ہمارا ادب''، ''منٹو فسادات پر''، مشمولہ انسان اور آدمی۔ علاوہ ازیں منٹو کے حوالے سے ''منٹو(۱)'' ؛''منٹو(۲)'' مشمولہ ستارہ یا بادبان اور ''سعادت حسن منٹو''، مشمولہ مقالات محمد حسن عسکری، ج ۱

۹۔ محمد حسن عسکری، ''منٹو کے افسانے'' (جنوری فروری ۵۱ء)، مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب، ص۱۷۳؛ منٹو کی طرف سے اس حقیقت کو قبول کرنے کا اعتراف اختتامیہ یزید میں موجود ہے۔

۱۰۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص۴۹-۴۸؛ ان صفحات پر انتظار حسین نے اس زمانے کی پوری ادبی سیاست پر روشنی ڈالی ہے؛ منٹو اور عسکری کے خلاف برپا جنگ کی ''ترقی پسندانہ مصلحتوں'' کے مزید احوال کے لئے ر.ک پروفیسر فتح محمد ملک، سعادت حسن منٹو۔ ایک نئی تعبیر

۱۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سعادت حسن منٹو۔ ایک نئی تعبیر، ص۲۷

۱۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند تحریک، ص۹۵

۱۳۔ قاسمی، احمد ندیم، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر، ۲۰۰۲ء، ص۸۰

۱۴۔ عسکری کے ایک خط نوشتہ ۲۹ جنوری ۱۹۴۷ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ پہلے بھی عسکری کا بائیکاٹ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا: ''سنا ہے کہ ترقی پسند تو میرا اتنے زوروں سے بائیکاٹ کر رہے ہیں کہ جن رسالوں میں میرے مضمون چھپیں گے ان میں مضمون تک نہیں لکھیں گے''۔ بنام آفتاب احمد، ڈاکٹر، خط ۲۹ جنوری ۱۹۴۷

۱۵۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ء مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے عزیز ابن الحسن، ''اختر حسین رائے پوری: دو تصویریں''، بازیافت، شمارہ ۱۷، لاہور، جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۰

۱۶۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں، ص ۳

۱۷۔ آج، مدیر اجمل کمال، کراچی، شمارہ ۳۲، ص ۲۱۱

۱۸۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۶۲

۱۹۔ خلیق ابراہیم خلیق، منزلیں گرد کے مانند۔۔۔، فضلی سنز، کراچی، 1999، ص 700

۲۰۔ اردو ادب، مرتبین سعادت حسن و محمد حسن عسکری، لاہور، مکتبہ جدید، شمارہ ۲، ص ۳۱۷ و بعد

۲۱۔ اردو ادب، شمارہ ۲، ص ۳۲۰

۲۲۔ اردو ادب، شمارہ ا کا داریہ؛ گو کہ اس اداریے پر نام عسکری اور منٹو دونوں کا ہے، مگر اسلوب کی کاٹ چغلی کھائے دیتی ہے کہ یہ منٹو کی تحریر ہے۔

۲۳۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، ص ۶۵ و بعد؛ ''رواں دواں''، احمد ندیم قاسمی کا کالم،

Ahmed Nadeem Qasmi on Manto, http://istaara0.tripod.com/id13.html

۲۴۔ منٹو، سعادت حسن، اختتامیہ یزید ''جیب کفن''، مشمولہ کلیات منٹو، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ج ا، ص ۲۰۳۔۲۰۲

۲۵۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۳۷

۲۶۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، ص ۲۶۹

۲۷۔ دیباچہ چغد، از منٹو؛ تفصیل پروفیسر فتح محمد ملک، منٹو۔ایک نئی تعبیر،

۲۸۔ اردو ادب، شمارہ ۲، ص ۳۱۳

۲۹۔ ''منٹو کے نام کھلا خط''، از احمد ندیم قاسمی، شائع شدہ سنگ میل، پشاور، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء اور اب یہ ان کی کتاب میرے ہم سفر، میں شامل ہے، ص ۸۷۔۷۸

۳۰۔ دیباچہ چغد، ۱۹۵۰، ص ۱۹۱

۳۱۔ دیکھئے مکتوب عسکری بنام ممتاز شیریں، ۲۰ جولائی ۱۹۴۸ء، مشمولہ مکاتیب محمد حسن عسکری، ص ۸۴

۳۲۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۴۹

۳۳۔ ''جائزے۔ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس''، مشمولہ سویرا، ۸۔۷، ص ۲۴۴

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ادارۂ ادب لطیف جواب دے'' سویرا، ۸۔۷، ص ۲۶۱۔۲۵۹، ۲۵۵۔۲۵۴

۳۵۔ Watson, The Literary Critics, p 9

۳۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۵۵

۳۷۔ منٹو، سعادت حسن، کلیات منٹو، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ج ا، ص ۲۰۳

۳۸۔ یہ ''میاؤں'' اور منٹو کی تردید کا قصہ بھی قاسمی صاحب نے سنایا ہے۔دیکھئے ادبی مکالمے، ص ۴۷، میرے ہم سفر، ص ۶۲۔۶۱

۳۹۔ اردو ادب، شمارہ ۲، ص ۳۱۱

۴۰۔ مقالات محمد حسن عسکری، ج ا، ص ۴۱۵

۴۱۔ منٹو کی پاکستانیت پر نئے مباحث کے لئے دیکھئے دنیا زاد، مدیر آصف فرخی، شمارہ ۱۳